

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

انسانیت کے لیے اس گھڑی سے زیادہ منحوس کوئی گھڑی نہ تھی جب اُس نے اپنی شیرازہ بندی کے لیے روحانی رشتوں کو یکسر نظر انداز کر کے مادی رشتوں کو بنیاد بنانے کی کوشش کی۔ انسانیت کا اصل جوہر روحانی اور اخلاقی ہے جب اس جوہر کو ناقابل التفات سمجھتے ہوئے اور انسانیت کے مادی عناصر کو اس کا حقیقی جوہر قرار دیتے ہوئے انسانوں کے اندر اجتماعی نظم قائم کیا جانے تو ان کے مابین تفریق اور منافرت کا پیدا ہونا بالکل ناگزیر ہو جاتا ہے۔ انسان کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اور اسے اس کے صحیح مرتبے اور مقام سے آشنا کرنے کے لیے باری تعالیٰ نے جتنے انبیاء علیہم السلام بھی مبعوث فرمائے انہوں نے جس طرح اُسے بندگی رب کی دعوت دی اسی طرح اس کو یہ بھی بتایا کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے۔ اور یہ بات اس کے ذہن نشین کرانی کہ اس کا حقیقی جوہر اخلاقی و روحانی ہے اور اس بنا پر اس کی شیرازہ بندی کے لیے یہی اساس سب سے زیادہ موزوں اور اس کے مزاج سے پوری طرح مطابقت رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے ان بادلوں کے برعکس شیطان نے ہمیشہ رنگ نسل، وطن، زبان، اور معاشی و معاشرتی طبقات جیسے مادی رشتوں پر زور دیا اور انسان کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ انسانوں کی جتنہ بندی ایسی ہی مادی بنیادوں پر ہونی چاہیے۔

دنیا کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جب انسان اور انسان کے درمیان روحانی اور اخلاقی رشتے کمزور ہوئے تو پھر ان کی جگہ علاقائی، نسلی اور لسانی تعصبات نے زور پکڑا اور انسانیت کے وسیع تر تصور کی جگہ چھوٹی چھوٹی قومیتوں کا تصور ابھرا۔ اس انقلاب کے لیے یوں تو تاریخ کے کئی ادوار کی نشاندہی کی جا

سکتی ہے، لیکن دور جدید میں فکر و نظر کی یہ غیر معمولی تبدیلی یورپ کی نشاۃ ثانیہ سے شروع ہوئی اور ابھی تک انسان اور انسان کے درمیان انسانی اخوت کے رشتے کو قائم نہیں کر سکی۔

مسیحیت اگرچہ پچھڑی صدیوں اور پندرہویں صدی سے کافی پہلے بہت حد تک بگڑ چکی تھی اور اس میں یہ اخلاقی قوت باقی نہ رہی تھی کہ انسان کو مادیت کی یلغار سے محفوظ رکھ سکے، مگر ان ساری خامیوں کے باوجود اس نے اپنے ماننے والوں کے درمیان مذہب کی اساس پر اخوت کا ایک رشتہ قائم کر رکھا تھا جس کا وجود اس بات کی شہادت فراہم کر رہا تھا کہ انسان ابھی تک اخلاقی اور روحانی رشتوں کو خاک و خون کے اتفاقی اور مادی رشتوں سے مضبوط سمجھتا ہے۔ مگر نشاۃ ثانیہ کے بعد، جسے فی الحقیقت روحانیت پر مادیت کا تسلط کہا جاسکتا ہے، صورت حال بالکل بدل گئی۔ پروٹسٹنٹ تحریک نے پوپ کی مرکزی حیثیت کو ختم کر دیا۔ مسیحیت ایک عالمگیر مذہب کے اونچے مقام سے گر کر قومی مفادات کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ گئی۔ جس تحریک کو سادہ لوح عوام اصلاح مذہب کی تحریک سمجھتے ہیں وہ درحقیقت مذہب کی بالادستی ختم کرنے کے لیے مادہ پرستوں کی منظم سازش تھی۔ اس کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ صنعتی انقلاب نے لوگوں کے اندر دولت پرستی کا جو جنون پیدا کیا ہے اس کی راہ میں مذہبی رکاوٹوں کو ختم کیا جائے۔ اس کے نتیجے میں ہر قوم نے اپنے حالات کے مطابق اپنا الگ کلیسائی نظام قائم کیا، اپنی عبادات تک کی زبان قومی بنائی، اور قومی تقاضوں کے تحت مذہبی تعلیمات میں تغیر و تبدل کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ مذہب جلد ہی قومی مفادات کا آلہ کار بن کر رہ گیا اور زندگی کے معاملات میں اس کا کوئی عمل دخل باقی نہ رہا۔ اس بنیادی تغیر کے بعد ہی مغرب میں نیشنلزم، سیکولرزم اور سرمایہ داری کے نقشے اٹھے اور پھر اشتراکیت آئی۔

اشتراکیت جسے قومی سرمایہ داری یا اجتماعی مادہ پرستی کہا جاسکتا ہے، اس نے بھی مذہب کو ختم کرنے کے لیے قریب قریب یہی حربے اختیار کئے ہیں۔ لیکن اس کے ان حربوں کی اثر آفرینی کا مسیحی دنیا میں اچھی طرح مطالعہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائیت کو خود مسیحیوں نے ایک بالکل بیکاری چیز بنا کر رکھ دیا ہے۔ اشتراکی اب وہاں اپنی مذہب دشمنی کے ارمان نکالنے کے لیے کچھ زیادہ مواقع نہیں پاتے۔ ان کی کوششوں کا ہدف

اب اسلام ہے اور وہ ہر جگہ اسلام کو دنیا کی سب سے زیادہ ناکارہ اور غیر موثر قوت بنانے کے درپے ہیں۔ اُن کی ان کوششوں کا اگر وقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو ان میں چار واضح رجحانات ملتے ہیں۔

سب سے پہلا رجحان جو اشتراکی تحریک میں صاف طور پر نمایاں نظر آتا ہے وہ دین کی عالمگیر حیثیت اور اُس کی بنیاد پر ایک بین الاقوامی برادری کے وجود کا خاتمہ ہے۔ اشتراکیت ایک لمحہ کے لیے بھی اس بات کو گوارا نہیں کر سکتی کہ دنیا کی کوئی قوم زبان، رنگ، نسل اور جغرافیائی حدود کو نظر انداز کر کے کسی اعتقادی اور اخلاقی دروہانی اساس پر اپنی قومیت کی تشکیل کرے۔ اس اساس کا وجود اشتراکیت کے لیے ناقابلِ برداشت ہے اور وہ اسے اپنے لیے ایک خونناک چیلنج سمجھتی ہے۔ قومیت کا یہ روحانی اور اخلاقی تصور اشتراکیت کے بنیادی تصور سے مغاثر رکھتا ہے اور اس کا عملی وجود اس کے سارے فلسفے اور نظریے کی نفی کرتا ہے۔ اس لیے وہ اپنا سارا زور اسی تصور کو مٹانے پر صرف کرتی ہے کہ محض ایک روحانی اور اخلاقی رشتہ انسانوں کو ایک دوسرے سے جوڑ سکتا ہے۔ چنانچہ اشتراکیوں کو جہاں بھی کام کرنے کے مواقع ملے ہیں انہوں نے وہاں مسلم قومیت کی اس وسیع اساس کو برباد کر کے، رنگ، نسل، علاقائی حدود اور مادی مفادات کی بنیاد پر چھوٹی چھوٹی قومیتوں کی صورت گری کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس ناپاک مقصد کے حصول کے لیے قریب قریب ایک ہی نوعیت کی تدابیر اختیار کی گئیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے کوشش کی جاتی ہے کہ مسلم آبادیوں کے اندر رچل پھر کر یہ دیکھا جائے کہ دین کے علاوہ اور کون سی چیز ان کے اندر وجہ اشتراک بن سکتی ہے۔ اس کا اگر کہیں سراغ مل جائے تو پھر سارا زور اُس کی اہمیت اور افادیت ذہن نشین کرانے پر صرف کیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی مخصوص علاقے کے رہنے والے ایک نسل سے تعلق رکھتے ہیں تو پھر ان کے نسلی تعصبات کو ابھارا جاتا ہے۔ اگر کہیں زبان کا رشتہ موجود ہو تو لسانی روابط پر زور دیا جاتا ہے۔ اگر کہیں معاشی مفادات وجہ شکایت ہوں تو ان مفادات کے حق میں زور دار پراپیگنڈا کر کے انہیں شدید سے شدید تر کیا جاتا ہے۔ الغرض اسلام کے علاوہ جس رشتے کی بھی نشاندہی کی جا سکے اس رشتے کو ہی مسلم معاشرے کے اندر اسلام کے مقابلے میں ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ

دیکھ لیجیے اسلامی ممالک میں مسلم قومیت کے مقابلے پر ان سارے غیر اسلامی رشتوں کی اہمیت پر زور دیا جا رہا ہے جنہیں اسلام نے جاہلیت سے تعبیر کیا ہے اور جنہیں اسلام دنیا سے بت پرستی کی طرح مٹانے آیا تھا۔ ان جاہلی تصورات کے نتیجے میں عرب اب اسلامی برادری کے علمبردار نہیں رہے بلکہ عرب قومیت کے علمبردار بن کر رہ گئے ہیں۔ اُن کے ہاں زبان کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کی جا رہی ہے اور اس طرح اسلام کی عالمگیر برادری عرب قومیت کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹ کر رہ گئی ہے۔

پھر ان ظالموں نے زبان کی بنیاد پر تشکیل پانے والی قومیت کو بھی برداشت نہیں کیا بلکہ ان چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں مزید انتشار پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ انتشار کی یہ صورت اتنی درد انگیز ہے کہ اُسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً سب سے پہلے زبان کی بنیاد پر عربی بولنے والی دنیا کو ملت اسلامیہ سے الگ کیا۔ اس میں شرق اوسط کے ممالک کے علاوہ مغرب اقصیٰ، زنجبار اور شمالی افریقہ کے بہت سے ممالک بھی آجاتے ہیں۔ پھر خاک و وطن کی اساس پر اس میں مزید حصے بخرے ہوئے اور عربی بولنے والی دنیا بہت سی چھوٹی چھوٹی قومیتوں میں تقسیم ہو گئی۔ اس کے بعد ان قومیتوں کے درمیان بھی رجعت پسندی اور ترقی پسندی کا جھگڑا اٹھا دیا گیا اور عربوں کی ساری قومیں ایک دوسرے ہی کی جڑ کاٹنے اور آٹے دن اپنے ہی گھر میں انقلابات برپا کرنے میں لگ گئیں جس کے نتائج کو آج ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تو قرآن مجید میں **لِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِلّٰهِ السُّلُوٰةُ وَلِلّٰهِ الْغَنِيَّةُ** (عزت تو اللہ کے لیے ہے اس کے رسول کے لیے اور مومنین کے لیے، فرمایا ہے۔ لیکن عرب قومیت کے پرستار اسے عربوں کی میراث سمجھ رہے ہیں اور العزّة للعصاة کے نعرے بلند کر رہے ہیں۔ اس سے زیادہ اور ظلم کیا ہو سکتا ہے کہ جس کلمے کو یہ لوگ آج اپنے لیے وجہ افتخار خیال کرتے ہیں وہ کفر ہے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ اور حجة الوداع کے موقعوں پر بڑی صراحت کے ساتھ جاہلیت کا کلمہ کہا ہے اور جس نسل اور وطنی نفاخر کے بارے میں حضور نے صاف طور پر کہا ہے کہ آپ انہیں مٹانے کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔

اسلام کو چھوڑ کر دوسری مادی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کرنے کی سزا امت مسلمہ کو یہ مل رہی ہے کہ اس کے اندر انتشار و انتشار پیدا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پہلے زبان کی بنیاد پر اس نے اپنے آپ کو مختلف چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کیا۔ پھر خاک و وطن سے تعلق کی بنیاد پر اس میں مزید تقسیم ہوئی۔ مگر دشمن اس انتشار پر بھی مطمئن نہ ہوا اس نے اس کے مزید حصے بخرے کرنے کے لیے اس میں لائنیں دھنسنے لگیں کھڑے کر دیے جن سے امت کے یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے یکسر منتشر ہو کر رہ گئے۔

ان فتنوں میں سب سے زیادہ خطرناک فتنہ زبان اور رسم الخط کا فتنہ ہے۔ کسی قوم کی علمی اور فصیح زبان محض اس کے بولنے والوں کے لیے خیالات کے اظہار کا ذریعہ ہی نہیں ہوتی بلکہ ان کے لاشعور میں ان کے دل پسند تصورات کی آبیاری بھی کرتی ہے۔ مسلم قوم کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والے اس حقیقت سے بوری طرح واقف ہیں، اس لیے انہوں نے مسلمانوں کے اندر علاقائی بولیوں اور عامی زبانوں کی ترویج و ترقی کی ایک خوفناک مہم شروع کر رکھی ہے۔ مثلاً عربی زبان کو ہی لیجئے۔ پہلے تو اس بنیاد پر عربی بولنے والوں کو پوری ملت سے الگ کیا گیا۔ مگر اس کے بعد انہیں یہ بات سمجھائی کہ یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کو فصیح عربی پڑھنے اور لکھنے پر مجبور کیا جائے کیونکہ یہ اس علاقائی بولی اور عام زبان سے مختلف ہے جو بچے بولتے ہیں۔ عامی زبان میں تعلیم دینے کا فائدہ انہیں یہ بتایا گیا کہ اس طرح طلباء کے ذہنوں پر بہت کم بوجھ پڑے گا اور دوسرے عوامی ادب جو دراصل کسی ملک کی ثقافت کی جان ہوتا ہے وہ تیزی سے نشوونما پائے گا۔

یہ سارے دلائل امت کو منتشر کرنے کے لیے بڑے خطرناک ہتھکنڈے ہیں۔ فصیح عربی اسلام کے پورے دینی علمی اور ادبی سرمائے کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس زبان کی حفاظت اور اس کی ترویج و اشاعت سے دینی احساسات اور تصورات کو غذا ملتی رہتی ہے اور امت کا اپنے ماضی سے رشتہ استوار رہتا ہے۔ اس لیے اسلام دشمن طاقتیں ایک لمحہ کے لیے بھی امت مسلمہ کو باہم جوڑنے اور اسلام سے وابستہ رکھنے والی اس قوت کو برداشت نہیں کر سکتیں۔ اس بنا پر دنیا کے ہر مسلمان ملک میں اس فتنے کی سرپرستی کی جا رہی ہے۔

اسی زبان کے سلسلے میں دوسرا فتنہ رسم الخط کی تبدیلی ہے۔ کسی زبان کا رسم الخط اس زبان کے ساتھ اور اس کے تہذیبی اور علمی پس منظر کے ساتھ نہایت گہرا تعلق رکھتا ہے۔ جس طرح معانی اور الفاظ کے پیکر کے مابین روح اور جسم کا تعلق ہوتا ہے بالکل اسی طرح رسم الخط اور الفاظ کے مابین ایک معنوی ربط پایا جاتا ہے جو رسم الخط کی تبدیلی کے ساتھ بکسر ٹوٹ جاتا ہے۔ حروف کی خارجی ہیئت انسان کے شعور اور لاشعور میں ایک خاص نوعیت کے تصورات اور احساسات کو ابھارتی ہے جن کی روشنی میں الفاظ کے پیکر میں معانی اور مطالب کے مخصوص رنگ بھرے جاتے ہیں۔ اس بنا پر دنیا کی ہر باشعور اور ہوشمند قوم نے اپنی تہذیب اور تہذیبی روایات کو زندہ رکھنے کے لیے رسم الخط کو غیر معمولی اہمیت دی ہے اور اس کی اسی احساس ذمہ داری کے ساتھ حفاظت کی ہے جس کے ساتھ کہ نظریاتی بنیادوں کی محافظت کی جاتی ہے۔

امت کے اندر ذہنی اور عملی خلفشار پیدا کرنے اور اسے دین سے برگشتہ کرنے کے لیے ایک اور فتنہ جسے مسلم ممالک میں بڑی شد و مد کے ساتھ اٹھایا جا رہا ہے وہ جاہلی تہذیبوں کا احیاء ہے۔ ان ممالک کے اندر اسلام سے قبل جاہلی تہذیب و تمدن کے جتنے ناپاک مظاہر موجود تھے اور اس جاہلیت کے جتنے نمایاں علمبردار تھے انہیں کیسے تحقیق کے نام پر، کیسے قوم پرستی کے نام پر اور کیسے تاریخی روایات کے نام پر ابھارا بھارا کر سامنے لایا جاتا ہے اور اس امر کی کوشش کی جاتی ہے کہ مسلمان اللہ کے دین، اس کی تہذیبی روایات اور اس کی نامور شخصیتوں سے قطع تعلق کر کے قبل از اسلام کی جاہلی تہذیبوں اور ان کے علمبرداروں کے ساتھ گہرا تعلق خاطر پیدا کریں۔ مصر میں فرعون کی تہذیب، شمالی افریقہ میں قبل از اسلام کی بربری تہذیب اور پاکستان میں گندھارا آرٹ کی سرپرستی، سب جاہلی تہذیبوں کے احیاء کے مختلف شاخسانے ہیں۔

امت مسلمہ کو جاہلیت کا پرستار بنانے کے لیے لادین قوتیں جو متعدد حربے استعمال کر رہی ہیں ان میں ایک حربہ ثقافت کا بھی ہے۔ دنیا کے تمام مسلمان ممالک میں یہ ثقافت ایک خوفناک طوفان کی صورت میں اٹھائی جا رہی ہے۔ اس نے نوغیز فلسفوں کو خاص طور سے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس خوفناک فتنے

کے برپا کرنے والے اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اس کے ذریعے امت کو دو طرف سے ضرب کاری لگائی جاسکتی ہے۔ اس سے ایک طرف تو قوم کے اخلاق برباد ہوں گے اور اس اخلاقی بربادی کی وجہ سے یہ قوم دین اور اخلاقی نقطہ نظر سے کسی کام کی نہ رہے گی۔ اس کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں اہل مغرب کی اخلاق سوز حرکات کی نقالی کرنے میں صرف ہوں گی اور اس طرح یہ امت مغربی تہذیب کے فسق و فجور کی وارث اور دنیا کی ساری برائیوں اور منکرات کی پوٹ بن کر رہ جائے گی اور یہ بُرائیاں اسے اندر ہی اندر ختم کر دیں گی۔

اس ثقافت کا اسلام دشمن طاقتوں کو دوسرا فائدہ یہ پہنچے گا۔ کہ امت کے اندر خوفناک خلفشار پیدا ہو گا۔ ہر علاقے اور مقام کی الگ الگ ثقافت کو دہاں پر تسلط اور برتری حاصل ہوگی اور اس طرح ایک ملک کے اندر رہنے والے مسلمانوں کے درمیان کوئی ایک چیز بھی ایسی باقی نہ رہے گی جو انہیں فکری اور نظریاتی ہی نہیں، معاشرتی اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے وابستہ رکھ سکے۔

اسلام دشمن قوتیں مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کسی بڑی سے بڑی اخلاقی سوز حرکت کے ارتکاب سے باز نہیں رہتیں۔ ان شیطانی قوتوں نے صدیوں سے بسی ہوئی خالص مسلم آبادیوں میں غیر مسلموں کو لایا یا ہے اور مسلمانوں کو ان بستیوں سے جبراً نکال دیا ہے تاکہ ان کے اندر وحدت باقی نہ رہے۔ خالص مسلم آبادیوں کو مخلوط آبادیوں میں تبدیل کرنے کے لیے اور مسلم اکثریت کے علاقوں کو مسلم اقلیت کے علاقوں میں بدلنے کے لیے سرخ اور سفید سامراج نے جو شرمناک کھیل کھیلے ہیں وہ تاریخ کی نہایت ہی عبرت انگیز اور الماناک داستانیں ہیں جنہیں پڑھنے کے بعد انسان کا انسانیت پر ہی سے اعتماد اٹھنے لگتا ہے اور آدمی سوچتا ہے کہ کیا عدل و انصاف کے الفاظ محض ادھام ہیں جن کا عالم واقعات میں کوئی وجود نہیں۔ گزشتہ صفحات میں تو ہم نے ان حربوں کا محض تذکرہ کیا ہے جو امت مسلمہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے سفید اور سرخ سامراج برہمابرس سے استعمال کر رہا ہے۔ اب ہم ان ریشہ دوانیوں کے چند عملی مظاہر پیش کرتے ہیں جن سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ ان سے امت مسلمہ کو کس قدر شدید نقصان پہنچا ہے۔ مگر اس

تفصیل سے پہلے ہم قومی وحدت کے بارے میں سرخ سامراج کے علمبرداروں کی اصول پرستی کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان لوگوں کے اصل عزائم کیا ہیں۔ انہیں مظلوم اور ستم زدہ قوموں سے کس قدر دلچسپی ہے اور چھوٹی چھوٹی بے بس قوموں کے بارے میں یہ کس نوعیت کے جذبات رکھتے ہیں اور انہیں ہرطرب کرنے کے یہ کس قدر حریص ہیں۔

روس میں جب اشتراکی انقلاب آیا تو وہاں کی قومیتوں کو یہ مژدہ جانفزا سنایا گیا کہ اب جلد ہی اس عامہ کے لیے ایک ایسا خوشگوار ماحول پیدا کیا جائے گا جس میں تمام نوآبادیوں کی آزادی کا التزام ہو گا اور وہ ساری قومیں جو استبداد کا شکار ہیں یا انسانی حقوق سے محروم ہیں انہیں آزادی کی نعمت سے نوازا جائے گا۔ مسلمانوں کو تو خاص طور پر دسمبر ۱۹۱۷ء کے اعلان کے ذریعہ اس بات کا یقین دلایا گیا کہ ان کے عقائد، اور رواج، ان کے قومی اور تہذیبی ادارے ہر طرح محفوظ رہیں گے مگر افسوس کہ یہ وعدہ ایک دن کے لیے بھی ایفانہ ہو سکا۔ اشتراکی لیڈروں پر اچانک یہ راز افشا ہوا کہ چھوٹی چھوٹی قومیتوں کا وجود اشتراکی نقطہ نظر سے بڑا خطرناک ہے اور انہیں جلد از جلد اشتراکی ریاست میں اس طرح مدغم کر دینا چاہیے کہ ان کا کوئی نام و نشان باقی نہ رہے۔ لینن نے ایک تقریر میں بڑے واضح الفاظ میں یہ کہا:

”محنت کش طبقے کا مفاد اسی میں ہے کہ روس کی ساری قومیتوں کے مزدوروں کو محنت کشوں

کی مختلف تنظیموں مثلاً سیاسی پیشہ وارانہ، اور تعلیمی اداروں میں مدغم کر دیا جائے اور یہ ادغام

اس کی جماعت کے تحت عمل میں آئے۔“

لینن کی یہ تقریر محض ایک رائے کا اظہار نہ تھی بلکہ یہ سرخ سامراج کی سیاسی پالیسی کا سنگ بنیاد

تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کا الگ قومی وجود اشتراکیت کے لیے بالکل ناقابل برداشت ہے۔ انہیں ملی اعتبار سے منتشر ہو کر اشتراکیت کی وسیع تر برادری میں شامل ہونا چاہیے اور اگر وہ اس سے انکار کریں تو پھر انہیں دنیا میں چینے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

جنوری ۱۹۱۸ء میں مسلمانوں کو وقتی طور پر خوش کرنے کے لیے سٹالن کی صدارت میں قومیتوں کا ایک ماموریہ COMMISSARIAT OF NATIONALITIES قائم کیا گیا جس کے تحت تین تاناری علماء کی زیر ہدایت مسلمانوں کے معاملات طے کرنے کے لیے ایک الگ ماموریہ تشکیل ہوا۔ اس ماموریہ کا کام یہ تھا کہ تمام مسلم ریاستوں میں یعنی ازبکستان، تاجکستان، ترکمانستان، قرغیزستان اور قازقستان میں مسلمانوں کے اندر اشتراکی رجحانات کو راسخ کرنے کے لیے کمیٹیاں قائم کی جائیں۔ جون ۱۹۱۸ء میں ملانور کی زیر قیادت مسلمان اشتراکیوں کی روسی جماعت معرض وجود میں آئی۔ یہ جماعت چند ماہ کے بعد ٹوڑ دی گئی اور مسلمانوں کے تمام معاملات روسی کمیونسٹ پارٹی کی مسلمان تنظیموں کے مرکزی بیورو کو تفویض کر دیے گئے۔ مارچ ۱۹۱۹ء میں لفظ مسلمان کو مٹا کر اس ادارے کا نام اقوام مشرق کی تنظیم رکھا گیا۔ اس کے فوراً بعد ”مسلمان ماموریہ“ کو بھی ختم کر دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اشتراکیت کے علمبردار یہ بات کسی صورت بھی گوارا نہ کر سکتے تھے کہ مسلمانوں کا الگ قومی وجود کسی حیثیت سے بھی برقرار رہے۔ ان کے لیے مسلمان اشتراکیوں کی الگ جماعت کا وجود بھی ناقابل برداشت تھا۔

اشتراکیت کے اس اسلام کش طرز عمل کی وجہ ہم ان صفحات میں متعدد بار بیان کر چکے اور اس حقیقت کی صراحت کر چکے ہیں کہ اسلام اور اشتراکیت دو ایسے الگ نظامائے حیات ہیں جو زندگی کے ہر مرحلے پر ایک دوسرے سے متصادم ہیں۔ عقیدہ اور عمل کا کوئی ایک جزو بھی ایسا نہیں جس میں ان دونوں کے مابین کسی طرح سے بھی اتفاق ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکیت کے لیے سب سے زیادہ ناقابل برداشت چیز اسلام ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف یوں تو اہل مغرب کی مختلف تحریروں میں موجود ہے مگر حال ہی میں مشہور مستشرق پروفیسر آربری کے زیر ادارت جو ضخیم کتاب ”شرق اوسط میں مذہب کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں اس حقیقت کو بڑے واضح الفاظ میں تسلیم کیا گیا ہے۔

”سویت حکومت کا مذہب کے بارے میں رویہ زار کی حکومت سے یکسر مختلف ہے۔ اسلام

میں مابعد از الطبعی حقائق پر ایمان چھونکہ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے یہ حقائق اول رد نہ ہی

سے اشتراکی بورش کا بدف بنے رہے۔ مگر اشتراکیت کی اسلام دشمنی کی بڑی وجہ اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ عالمگیر دین ہے۔ اسلام کا یہ پہلو اشتراکیت کے نزدیک قدیم کلیساؤں کے نظام سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ جہاں تک نظام حیات میں نے کا تعلق ہے اشتراکیت اسلام کو مسیحیت کے کسی فرقے سے کہیں زیادہ خطرناک اور قابل اعتراض خیال کرتی ہے۔ اصلاح مذہب اور نشاۃ ثانیہ کی تحریکات نے مسیحیت اور جدید زندگی کے درمیان مصالحت کی راہ پیدا کر دی ہے مگر مسلمانوں کے ہاں کوئی ایسی اصلاحی تحریک نہیں اٹھی جس نے اسلام کو قرون وسطیٰ کے بندھنوں سے آزاد کرایا ہو۔ اس بنا پر سوویت رہنما اسے ایک ایسا چیلنا اور فرسودہ نظام حیات خیال کرتے ہیں جو مادی ترقی کا دشمن ہے جس کی پہلے مشرقی آمروں اور جاگیرداروں نے پرورش کی اور بعد میں مغربی سامراج نے اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لیے سرپرستی کی۔

اشتراکیت اور اسلام کے مابین بنائے نزع کی اصل نوعیت سمجھنے کے بعد اب یہ دیکھئے کہ مختلف مسلم ممالک میں مسلمانوں کو دینی اور سیاسی اعتبار سے ناراج کرنے اور ان کی وحدت کو توڑنے کے لیے اشتراکی عملاً کسی قسم کی کاروائیاں کر رہے ہیں۔ ہم اپنی گزارشات کا آغاز حق خود ارادیت اور قومی آزادی کی سب سے بڑی علمبردار اشتراکی ریاست روس سے کرتے ہیں۔

روس کا سوویت وفاق ۱۶ بڑی جمہوریتوں پر مشتمل ہے۔ ان سولہ جمہوریتوں میں ۸ جمہوریتیں، جن کے نام پہلے گنوانے جا چکے ہیں، خالص مسلم آبادیاں ہیں۔ باقی ۸ میں بھی مسلمانوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ اسی ضمن میں سب سے پہلے روسی ترکستان میں اسلام کا احترام دیکھئے۔ یہ علاقہ دو حصوں میں بٹ چکا ہے۔

- ۱۔ جمہوریہ ترکستان ۲۔ جمہوریہ تاجکستان ۳۔ جمہوریہ ترکمانستان ۴۔ جمہوریہ قرغزستان ۵۔ جمہوریہ قازقستان
- ۶۔ جمہوریہ آذربائیجان ۷۔ جمہوریہ جارجیا ۸۔ جمہوریہ آرمینیا ۹۔ جمہوریہ روسیہ ۱۰۔ جمہوریہ استونیا ۱۱۔ جمہوریہ لٹویا
- ۱۲۔ جمہوریہ بیلاروس ۱۳۔ جمہوریہ سفید روسیہ ۱۴۔ جمہوریہ لٹویا ۱۵۔ جمہوریہ فن لینڈ ۱۶۔ جمہوریہ لیتھوانیا۔

مغربی حصہ روس میں شامل ہے اور مشرقی حصہ جسے چینی ترکستان یا سنکیانگ کہا جاتا ہے، چین کے قبضے میں ہے۔
مورخین نے اسی علاقے کو ترکستان بھی لکھا ہے اور ماوراء النہر بھی کہا ہے۔ اس علاقے میں لاتعداد علماء اور فقہاء
پیدا ہوئے جن کے علماء کے کارنامے آج تک دینی ادب کا بیش قیمت سرمایہ سمجھے جاتے ہیں۔

اشتراکیت نے عنان اقتدار سنبھالنے ہی ترکستان کے اسلامی اداروں کو بند کیا اور اسلامی تنظیموں کو
خلافت قانون قرار دیا شرعی عدالتیں بھی ختم کر دی گئیں اور مساجد اور مذہبی درسگاہوں کے اوقات بحق سرکار
ضبط کر لیے گئے۔ جنوری ۱۹۱۸ء میں ریاست کو کلیسا یا مذہب سے الگ رکھنے کے لیے ایک قانون وضع کیا
گیا جس نے مسلمانوں کو دینی اعتبار سے زبردست نقصان پہنچایا۔ اس قانون کے مطابق نماز باجماعت جرم قرار
پائی۔ یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ نماز میں وہ ساری تقریبات شامل ہیں جن کا دین سے کوئی دور کا بھی تعلق ہے۔
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس ترکستان میں سات سو سے لے کر ایک ہزار تک کی آبادی کے ہر محلے میں ایک جامع مسجد،
چھ ہزار تین سو سے زائد دینی مکاتب، سو سے زائد ثانوی معیار کے دینی مدارس اور اعلیٰ پیمانے کے دارالعلوم
تھے۔ وہاں چند سالوں میں الحاد اور بے دینی کے بھیانک مناظر سامنے آنے لگے۔ ان مساجد اور مدارس میں
لینن کلب اور سرخ چائے خانے قائم ہوئے اور علمائے حق یا تو چن چن کر ہلاک کر دیے گئے یا انہیں بیگار کمپوں
میں رکھ کر ان سے اس قدر مشقت لی گئی کہ وہ لقمہ اجل بن گئے۔

دوسری طرف جلد جلد الحادی انجمنیں قائم کی گئیں تاکہ اسلام کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت کے جذبات
پیدا کیے جائیں۔ روس کے مشہور اخبار پراوا داکا کی ایک رپورٹ کے مطابق، انجمن الحاد کے پاس ۱۹۲۷ء میں
مجموعی کارکنوں کی تعداد صرف تاجکستان کے اندر ۲۷ ہزار تھی اور اس کے شہروں میں اس انجمن کی بارہ سو
شاخیں کام کر رہی تھیں۔ ۱۹۲۹ء میں ان مختلف شاخوں کے اندر مذہب کے خلاف ڈیڑھ ہزار لیکچر دیے
گئے تاجک بستیوں کے اندر ایک ہزار ایسی تقریریں کی گئیں جن میں خدا اور پیغمبر اور دوسری ”مذہبی خرافات“
کی قلعی کھولی گئی۔

روس کی اشتراکی حکومت نے ان حربوں کے ساتھ ساتھ ترک آبادیوں کے اندر عربی رسم الخط کی جگہ لاطینی رسم الخط کو نافذ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ ۲۴ فروری ۱۹۲۶ء میں آذربائیجان کے صدر مقام پر ایک کانفرنس منعقد کی گئی جسے روسی حکام نے ترک کانفرنس کا عنوان دیا۔ اس میں رسم الخط کی تبدیلی کا فیصلہ کیا گیا۔ اس فیصلے پر لنین نے وفور جذبات میں کہا ”یہ مشرق کا سب سے بڑا انقلاب ہے اس انقلاب نے ملاؤں کے ہاتھ سے وہ کارگر ہتھیار چھین لیا ہے جس کے ذریعے وہ عوام پر مذہب کا دباؤ ڈالتے رہتے تھے۔ یہ لاطینی رسم الخط صرف دس سال تک مروج رہا۔ ۱۹۳۷ء میں روسی حکومت نے ایک نئی قرارداد کے ذریعے اسے منسوخ کر کے اس کی جگہ روسی حروف کو رائج کیا۔ رسم الخط کی یہ تبدیلی صرف ترکستان تک ہی محدود نہ تھی بلکہ یہ تبدیلی مسلم اکثریت کی دوسری ریاستوں یعنی آذربائیجان، جارجیا، اور آرمینیا میں بھی کی گئی۔

مسلمانوں کے عاقبت اندیش طبقے کو شروع ہی سے اس امر کا اندازہ تھا کہ یہ تبدیلی کس ناپاک مقصد کے لیے لائی جا رہی ہے۔ اسی بنا پر کانفرنس میں اس تجویز سے اختلاف کیا گیا۔ اور والگا اور ال اور سائبیریا کے وفد کے سربراہ مشہور لغت دان کلیم جان ابراہیموف اور باشکری وفد کے قائد شاربیف نے ان خطرات کی نشاندہی کی جو اس تبدیلی میں مضمر تھے۔ کانفرنس کے اختتام پر جب مختلف وفود واپس گئے تو انہوں نے ایک یادداشت میں عربی رسم الخط کی تنسیخ پر فریاد کی۔ مگر اس فریاد کا یہ اثر ہوا کہ تعلیمی اداروں اور سودیتی مصنفین کی یونین سے ان تمام عناصر کو نکال دیا گیا جنہوں نے اس تجویز کی ذرا بھی مخالفت کی تھی۔ جن لوگوں نے ذرا کھل کر احتجاج کیا انہیں قید میں ڈال دیا گیا۔ اس جرم کی پاداش میں کلیم ابراہیموف کو جو ۱۹۱۸ء سے کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم رکن چلے آ رہے تھے قید و بند کی بے پناہ صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ جہاں قازان جیل میں ۱۹۳۹ء میں ان کا انتقال ہوا۔ جمہوریہ تاتار کے ناظم تعلیمات اسحاق قزاقوف اور سلطان گالیف کو بھی اس اختلاف کی سخت سزا بھگتنی پڑی۔ اس تبدیلی کا نتیجہ وہی نکلا جس کا مسلمانوں کو اچھی طرح احساس تھا یعنی نئی نسل اپنے دینی تصورات اور احساسات سے یکسر بیگانہ ہو گئی اور ماضی سے اس کا کوئی تعلق باقی نہ رہا۔ مسلمانوں کا سارا علمی سرمایہ اس کے نزدیک رقی کے ڈبیر سے زیادہ کوٹی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ عربی رسم الخط میں چھپی ہوئی تمام کتابیں جمع کی گئیں اور انہیں غیر مفید قرار دے کر

یا جلادیا گیا اور یا کاغذ ساری کے کارخانوں کی تحویل میں دے دیا گیا تاکہ ان انباروں کو کاغذ بنانے کے لیے استعمال میں لے آئیں۔

روس میں دینی لٹریچر کا کیا حشر ہوتا ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اشتراکی انقلاب سے پیشتر روس میں ۲۳ مسلم پریس، ۱۰ اخبار مذہبی جرائد اور ۱۹۶ ایسے کتب خانے تھے جو دینی ادب کی ترویج اشاعت کا کام کرتے تھے۔ مگر اب بد قسمتی سے وہاں کوئی ایک پریس بھی ایسا باقی نہیں رہا جس میں اسلامی لٹریچر شائع کیا جاتا ہو۔ ۱۹۳۸ء کے بعد بڑی مشکل سے صرف قرآن مجید کی طباعت کی اجازت ملی ہے اور اسے روسی حکومت کی بہت بڑی فیاضی سمجھا گیا ہے۔ سرکاری کاغذات میں عربی میں شائع ہونے والے دو جرائد کا ذکر بھی ملتا ہے مگر ان میں سے کسی ایک رسالے کی کوئی کاپی باہر کی دنیا نے نہیں دیکھی۔ سویت روس کی سرزمین میں ایسے کتب خانوں سے یکسر خالی ہے جو دینی لٹریچر کے لیے وقف ہوں۔ حال ہی میں ایک پاکستانی اشتراکی نے تاشقند میں امور مذہبی کے تحت ایک ایسی لائبریری کا انکشاف کیا ہے جس میں کل آٹھ ہزار کتب ہیں۔ ان میں عربی کتب کی تعداد صرف ڈھائی سو ہے۔

اسی سلسلے میں ایک نگاہ اس طبقے کی مظلومیت پر بھی ڈال لیجیے جسے اشتراکیت کے ہاتھوں سب سے زیادہ مظالم سہنے پڑے۔ اشتراکیوں کا یہ طرز عمل ان کے مذہب دشمن مزاج کے عین مطابق ہے۔ چونکہ اس نظام کی ساری بنیاد ہی اتحاد اور مادیت پر رکھی گئی ہے اور اس کا مقصد ہی دنیا میں لادینیت کا فروغ اور تسلط ہے اس لیے اس کے جبر و استبداد کا سب سے زیادہ نشانہ وہی لوگ بنے ہیں جو دینی تعلیمات کے امین کہلاتے ہیں۔ اشتراکیوں نے دنیا کے ہر ملک میں علماء اور مذہبی طبقوں کو ہی خاص طور پر اپنے ظلم کا تختہ مشق بنایا ہے۔ ترکستان میں قانون تعزیرات کی دفعہ ۵۸ کے تحت علماء کو تمام شہری حقوق سے محروم کر دیا گیا اور ان میں سے ایک کثیر تعداد کو یہ کہہ کر جیلوں میں ڈھونس دیا گیا کہ یہ عوام کو اشتراکی نظام کے خلاف اکساتے ہیں۔ بحر ابیض کی نہر کی

کھدائی کے لیے روسی حکام نے جن قیدیوں کو بیگار کے طور پر بھیجا ان کے اندر کثیر تعداد اُن حق پسند علماء کی تھی جنہیں جلا وطنی کی سزائیں ملی تھیں۔ آذربائیجان میں نامور علماء کی ایک اچھی خاصی تعداد کو روسی سفاک حاکم ینیزوف نے تختہ دار پر لٹکا دیا۔ ان شہداء میں آغا علی زادہ، باکو کے قاضی میر محمد کریم، شیخ حسن، شیخ غنی، ملا تقی اصفہانی ولد عبداللہ، اور شیخ عبدالغنی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جو علماء پھانسی سے بچ گئے ان کے خلاف نشر و اشاعت کے مختلف ذرائع سے نہایت شرمناک پراپیگنڈا کر کے انہیں معاشرے میں ذلیل اور رسوا کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ تصویروں اور کارٹونوں کی مدد سے انہیں طفیلی اور مفت خوردے ظاہر کیا گیا۔ تقیڑوں میں ان کے خلاف ڈرامے ایسٹیج ہوئے اور افسانوں اور کہانیوں کی مدد سے انہیں انسانیت کے بدخواہ کے طور پر پیش کیا گیا اور مسلم قوم کی نوخیز نسل کے دل و دماغ میں یہ خیال راسخ کرنے کی کوشش کی گئی کہ جس طبقے کو تم اپنا رہنما سمجھتے ہو اور جس کی طرف تم رشد و ہدایت کے لیے رجوع کرتے ہو وہ تو چوروں اور ڈاکوؤں کا ایک خطرناک گروہ ہے جو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ساتھ مل کر تمہیں مختلف جیلوں اور بہانوں سے لوٹا رہا ہے۔ اب وقت ہے کہ تم ان سے پوری طرح انتقام لو اور انہیں مٹانے میں حکومت کا ساتھ دو۔ یہ اسی غلط پراپیگنڈے کا اثر تھا کہ بعض مقامات پر مزدور یونینوں نے مسجدیں بند کرنے اور انقلاب دشمن مولویوں کو عبرتناک سزائیں دینے کی قراردادیں پاس کیں۔

اشتراکیت کی مذہب دشمنی کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ اس نے بڑی چالاک اور عیاری سے علماء کو علماء کے ہاتھوں برباد کر دیا۔ اس نے سب سے پہلے ایک لگی بندھی سازش کے تحت علماء اور عوام کو یہ تاثر دیا کہ اشتراکیت کے علمبردار اُن علماء کی دل و جان سے قدر کرتے ہیں جو غریبوں اور بے کسوں کے حامی ہیں اور پسے ہوئے طبقوں کو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے انقلاب کا ساتھ دے رہے ہیں۔ انہیں اگر دشمنی ہے تو علماء سب سے بے علماء سو سے اشتراکیوں کی مراد وہ علماء ہیں جو مادیت پرستی کے اس طوفان کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور جن کی بصیرت کی آنکھوں کے سامنے مذہب، اخلاق اور وحایت کی بربادی بالکل عیاں ہے۔ اشتراکیت کے علمبردار علماء سو کی جو تعریف کرتے ہیں اُسے اگر اور وسیع کیا جائے تو ان کے نزدیک وہ سارے مسلمان علماء سوا سرمایہ داروں اور

استعمار پرستوں کے ایجنٹ ہیں جو اشتراکیت کے دل و جان سے حامی نہیں خواہ وہ استعماریت اور سرمایہ داری کے بھی اتنے ہی مخالف ہوں جتنے کہ اشتراکیت کے رگڑا سے مسلم قوم کی بدقسمتی سمجھنے کے علماء کا ایک گروہ اشتراکیت کی اس ناپاک سازش کا شکار ہو گیا اور اُس نے حالات کو سمجھے بغیر خود اشتراکیوں کا آلہ کار بن کر دین اور علماء کی بربادی کا سامان کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اشتراکیت کے زیرِ دام آنے والے علماء کی ایک اچھی خاصی تعداد وہ تھی جسے اس انقلاب کی تباہ کاریوں اور اشتراکیت کو از طرزِ عمل کے نتائج کا آغاز میں کوئی اندازہ نہ تھا مگر عالمِ واقعات میں جب اس کے نتائج سامنے آئے تو انہیں اس امر کا احساس ہوا کہ یہ تحریک جسے وہ اپنی دانست میں مظلوم الحال طبقوں کو سرمایہ داروں کی ریشہ دوانیوں سے نجات دلانے کی تحریک سمجھ رہے تھے درحقیقت اسلام اور روحانی اقدار کے خلاف ایک خطرناک سازش ہے اس احساس کے بعد ان علماء میں سے بعض نے اس کا راستہ روکنے کی سرٹوڑ کوشش کی اور اس مقصد کی خاطر جان تک کی بازی لگانے سے بھی گریز نہ کی مگر فتنے کا جو طوفان سیل بے پناہ بن کر اٹھ چکا تھا ان لوگوں کی کوششوں سے آخر کب ختم سکتا تھا۔ وہ انہیں اپنے ساتھ خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔

صحیح مرقہ کے مصنف نے ایک فریب خوردہ عالم فخر الدین حدادی کی اشتراکیت کے بارے میں خوش فہمی کا یوں ذکر کیا ہے۔

”میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ حکومت نے ہمارے ملک میں امن و آشتی قائم کر کے اپنے آپ کو مفلسوں اور فاقہ زدوں کا دست گیر اور کفیل ثابت کر دیا ہے۔ حکومت نے یہ چیز لازم سمجھی ہے کہ غریب طبقے میں تمام زمین بانٹ دی جائے۔ حکومت کے اس فعل پر میں اسے دعا دیتا ہوں یہ فعل عین نبی کی سنت ہے۔“

مگر یہ ”اصلاحی تحریک“ جب ابتدائی مشکلات پر غالب آنے میں کامیاب ہوئی تو اس کے علمبرداروں نے لوگوں پر اس کی اصل حقیقت آشکارا کرتے ہوئے بڑے واضح الفاظ میں کہا:

بعض تعلیم یافتہ ترک (آذربائیجان کے ترکمان) اس وہم میں مبتلا ہیں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سوشلسٹ تھا اور مارکس اور اینجلز اور لینن نے اپنے افکار قرآن سے اخذ کیے ہیں ہماری